Al-Azhār

Volume 7, Issue 1 (Jan-June, 2021)

ISSN (Print): 2519-6707

Issue: http://www.al-azhaar.org/index.php/alazhar/article/view/49

URL: http://www.al-azhaar.org/index.php/alazhar/article/view/49

Article DOI: https://doi.org/ 10.46896/alazhr.v7i01.53

Title The Rise and Fall of Nations in the Light of the Thoughts of Syed Abul Hassan Ali Nadvi

Author (s): Dr. Razia Shabana ,Dr. Fayyaz Ahmad Farooq and Afifa Rashid

Received on: 29 June, 2020
Accepted on: 29 May, 2021
Published on: 25 June, 2021

Citation: Dr. Razia Shabana ,Dr. Fayyaz Ahmad Farooq and Afifa Rashid , "Construction: The Rise and Fall of Nations in the Light of the Thoughts of Syed Abul Hassan Ali Nadvi," Al-Azhār: 7 no, 1 (2021): 111-136

Publisher: The University of Agriculture Peshawar

Click here for more

قوموں کا عروج وزوال سید ابوالحسن علی ندوی کے افکار کی روشنی میں

* ڈاکٹر رضیہ شبانہ
** ڈاکٹر فیاض احمد فاروق
***عفیفہ رشید

Abstract

Syed Abu ul Hasan Ali Nadvi is considered in those scholars who have sound knowledge on the rise and falls of nations, because the rise and falls of nations occurs on the base of their basic actions, thoughts and their ways of administration. The developed nations of the world attained their rise on the base of their actions, thoughts and ways of administration and some of them were declined due to pride and snobbery in their actions .These historical tales are being continue in the whole human history. And now days, this chain of rise and falls of different nations can be seen easily. In this article, Syed Abu ul Hasan's thoughts regarding rise and falls of nations have been visualized for analyzing the present conditions of Pakistan.

Keywords:

Introduction, rise and falls of nations, nationalism, decline of nation, hope for brightness.

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان
** اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ، انسٹی ٹیوٹ آف سدرن پنجاب ملتان
*** لیکچرر، شعبہ اسلامیات، وومن یونیورسٹی مردان

تعارف

عروج وزوال ایک ایسا منبع ہے جس سے قوموں کی تعمیر وترقی کا پتا چلتا ہے۔ جب بھی ہم مختلف معاشروں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ کسی بھی معاشرے میں معاشرتی استحکام میں قوموں کا عروج و زوال کافی حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ عروج وزوال کے آئینے میں ہم قوموں کی تاریخ کا جائزہ بھی لیتے ہیں، جس میں ارتقاقات زمانہ اور تغیر حالات بنیادی پیمانے کی حیثیت اختیار کرتے ہیں۔ اگر ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو دنیا میں شاید ہی کوئی قوم ایسی گزری ہو جس نے عروج وزوال نہ دیکھا ہو، گویا قوموں کا عروج وزوال ان کے بنیادی افعال، افکار اور نظم ونسق کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ یہ ایک فطری قانون ہے کہ اگر کوئی قوم زوال پذیر ہے تو جب تک وہ مسلسل کوشش کرتی ہے، زوال سے عروج حاصل کر لیتی ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے عروج پر فخر و تکبر کرتی ہے تو وہ تغیر زمانہ کے ساتھ زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ دنیا میں بڑی بڑی قوموں نے اپنے افعال، افکار اور نظم ونسق کی بنیاد پر عروج حاصل کیا اور پھر اپنے تفاخر کی وجہ سے زوال پذیر ہو گئیں۔ عروج وزوال کی یہ داستاں پوری انسانی تاریخ میں جاری رہی اور آج بھی عروج وزوال کا یہ سلسلہ مختلف نوعیتوں کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ انسانی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ بظاہر زوال اور پستی میں رہنے والی قوموں نے اپنی قوت کو یکجا کیا اور تاریخ کے اوراق میں اپنے بلند کردار کا لوہا منوایا۔ ہم جانتے ہیں کہ عروج وزوال کا نہ ختم ہونے والا یہ سلسلہ دراصل فطرت کے خزائن کا حصہ ہے۔ البتہ قوموں کے عروج وزوال پر نظر ڈالنے سے ایک بنیادی سوال ضرور سامنے آتا ہے کہ کیا قومیں خود بخود عروج وزوال کے دائرے میں گھومتی رہتی ہیں یا یہ کہ ان کا کردار، رویہ اور عمل ان کے عروج وزوال کی منزلیں متعین کرتا ہے۔

ہم اس مقالہ کے آنے والے صفحات میں قوموں کے عروج وزوال کا جائزہ لیتے ہوئے اس بنیادی سوال کا جواب بھی تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ بالخصوص مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے کس طرح قوموں کے عروج وزوال کو بیان کیا ہے اور اس عروج وزوال کے بنیادی عناصر ترکیبی کیا ہیں جو عروج وزوال کا سبب بنتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم سید ابوالحسن علی ندوی کا سرسری تعارف پیش کرتے ہیں، پھر اس کے بعد ہم قوموں کے عروج وزوال کے حوالے سے مولانا سید ابولحسن کے افکار کا جائزہ لیں گے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا تعارف

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا سلسلہ نسب اڑتیس (۳۸) واسطوں سے حضرت امام حسنؓ تک پہنچتا

ہے، اس لیے آپ حسنی کہلاتے ہیں۔ سید قطب الدین محمد المدنیؒ اس سلسلہ کے پہلے بزرگ تھے جو سب سے پہلے ہندوستان تشریف لائے، یہی وجہ ہے کہ ان کے نام کی مناسبت سے اس خاندان کو حسنی و قطبی سادات بھی کہا جاتا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے اجداد میں سید رشید الدین وہ پہلے شخص تھے جو چھٹی صدی ہجری میں مدینہ منورہ سے بغداد منتقل ہوئے اور انہوں نے بغداد میں ہی ۶۰۷ھ میں وفات پائی۔ شیخ رشید الدین کے بیٹے سید قطب الدین بغداد سے پہلے غزنی اور پھر ۶۰۷ھ میں غزنی سے اپنے عزیز واقارب و مریدین کی ایک جماعت کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور کٹرا مانکپور میں قیام کیا۔ ہندوستان میں اس وقت ترک سلاطین دہلی کی حکومت قائم ہوئے پانچ سال ہوئے تھے۔ اور سلطان شمس الدین التمش(۳۵۔۱۲۱۰ء) تخت حسنی شاہی پر متمکن تھا۔[1]

ولادت

سید علم اللہ شاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد(۱۷۰۸۔۱۶۵۸ء) میں اپنے خاندان کے ساتھ رائے بریلی کے قریب آکر آباد ہوئے تھے۔ رائے بریلی کے شمال مشرق میں تقریباً دو میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی آبادی جسے سید احمد شہیدؒ کے بعد "تکیہ" کا نام دیا گیا تھا۔ سید ابوالحسن علی ندوی اسی تکیہ یا دائرہ شاہ علم اللہ نامی بستی میں ۶ محرم ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ آپ ابھی ایک سال کے ہی تھے کہ ۱۹۱۵ء میں ہولناک طوفانی سیلاب آیا خاندان کے لوگ بے سروسامانی کی حالت میں نکلے، اور سید اقبال علی جعفری کی کوٹھی رائے بریلی میں پناہ گزین ہوگئے، اس بے سروسامانی کی حالت میں بھی بزرگوں نے اس کتابی ذخیرے کو محفوظ کر لینا ضروری سمجھا، جس کی وجہ سے بیش قیمت مخطوطات، فرامین، دستاویزات، سندوں، فتوؤں اور خاندان کے مصنفین کے مسودات محفوظ رہے۔ آپ کا خاندان یہاں سے ۱۹۲۱ء میں میدان پور اور پھر ذریعہ معاش کی وجہ سے امین آباد لکھنؤ منتقل ہوگیا۔[2]

عملی زندگی کا آغاز

جب ۱۹۳۴ء میں بیس برس کی عمر میں ابوالحسن علی ندویؒ کی باضابطہ و منظم حصول علم کی مدت ختم ہوگئی تو ایک خوددار انسان کی طرح اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ لوگوں کے طنزیہ و تنقیدی جملوں سے بچنے اور ہونے والی شادی نے ابوالحسن علی ندویؒ کے اندر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور باعزت ذریعہ معاش پیدا کرنے کی ضرورت کا احساس پیدا کر دیا۔ شروع میں سید ابوالحسن علی ندویؒ کی خواہش تھی کہ دارالمصنفین اعظم گڑھ میں سید سلیمان ندویؒ کی زیر نگرانی مطالعہ تصنیف و تالیف میں زندگی

صرف کریں اس کے لیے کم سے کم معاوضہ (۲۵، ۲۰روپے) پر قناعت کے لیے بھی تیار تھے۔ مگر سید صاحب نے یہ کہہ دیا کہ تمہارے لیے دارالعلوم زیادہ موزوں جگہ ہے اس سے ابوالحسن علی ندوی نے یہ سمجھا کہ انہوں نے معذرت کر لی ہے۔ اسی دوران مولانا مسعودی علی ندوی (جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم تھے) اپنی انتظامی قابلیت و تجربہ کی بناپر قابل احترام اساتذہ کی موجودگی میں تدریسی، تنظیمی نظام میں نئے خون کی آمد کے خواہاں تھے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۵جولائی ۱۹۳۴ء کے جلسہ انتظامی میں ابوالحسن علی ندویؒ کو ارکان کے اتفاق رائے سے چالیس روپے(۴۰) ماہوار پر بطور مدرس مقرر کر دیا۔ یکم اگست ۱۹۳۴ء سے ابوالحسن علی ندویؒ نے بحیثیت استاد تفسیر وادب کا کام شروع کر دیا۔[3]

شادی

نومبر ۱۹۳۴ء میں آپ کی شادی اپنی حقیقی ماموں زاد بہن (جو سید احمد سعید کی صاحبزادی، سید ضیاء النبی کی پوتی اور منشی عبدالرزاق کلامی صاحب "صمصام الاسلام" (منظوم ترجمہ فتوح الشام) کی نواسی) سے ہوئی۔ ولیمہ کا انتظام بڑے بھائی نے اعلیٰ پیمانے پر بڑی فراخ دلی اور خوشی سے کیا۔[4]

ابوالحسن علی ندویؒ کی ندوۃ العلماء میں خدمات

سید ابوالحسن علی ندویؒ کا دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلق خاندانی، موروثی اور ذاتی بنیادوں پر بھی تھا۔ مولانا کے والد سید عبدالحئی ندوۃ العلماء کے تاسیسی ارکان میں سے تھے۔ وہ (۱۸۹۵ء تا ۱۹۲۳ء) مددگار ناظم، معتمد مراسلت اور نظامت کے منصب پر فائز رہے اور مولانا کے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی (۱۹۲۳ء تا ۱۹۴۱ء) ندوۃ العلماء سے مختلف حیثیتوں سے وابستہ رہے۔ ۱۹۳۴ء میں ابوالحسن ندویؒ کا بطور استاد تفسیر و عربی زبان وادب کے ندوۃ العلماء میں تقرر کیا گیا۔ ۱۹۴۹ء میں آپ کو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ نے نائب معتمد تعلیمات اور جون ۱۹۶۱ء میں بحیثیت ناظم ندوۃ العلماء منتخب کیا اور دور نظامت میں مسلسل تجدید ہوتی رہی۔ ۱۹۶۱ء میں مولانا ابوالحسن ندویؒ کے عزیز بھائی فوت ہو گئے اور آپ کو ندوہ العلماء کے ناظم کی حیثیت سے منتخب کیا گیا۔ مولانا نے ذمہ داری بڑے احسن طریقے سے پوری کی۔

سید رضوان علی ندوی لکھتے ہیں:۔

"ان (علی میاں) کے عہد میں دارالعلوم نے جو ترقی کی وہ اس سے قبل کسی ناظم کے عہد میں نہیں ہوئی تھی۔ جہاں پہلے ایک منزلہ ہوسٹل (شبلی دارالاقامہ) تھا اب وہاں تین، چار منزلہ پانچ ہوسٹل تعمیر ہوئے۔ یہ طلبہ کی کثرت کی وجہ سے کرنا پڑا۔ نصاب میں جزری (Radical) اصلاحات کی گئی، نئے شعبے یا کلیات، قرآنی علوم،

عربی زبان و ادب، دعوت اسلام و اعلام (میڈیا (کھولے، اور تحقیقی کام پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کا انتظام کیا گیا۔ گویا دارالعلوم صحیح معنوں میں ایک اسلامی یونیورسٹی مولانا مرحوم کے عہد میں بن گیا"۔ (5)

وفات

عالم اسلام کے عظیم مفکر سید ابو الحسن علی ندوی نے ۲۲ رمضان المبارک بروز جمعہ، بمطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء، کو وفات پائی۔

ابو الحسن علی ندویؒ بحیثیت مصنف و مؤلف

سید ابو الحسن علی ندویؒ عالم اسلام کے ان عظیم اہل قلم اور مصنفین میں سے ایک ہیں جنہوں نے عقائد و عبادات، تفسیر آیات، عربی زبان و ادب اور سیرت جیسے موضوعات سے لے کر تاریخ، سوانح اور عالم اسلام کے مسائل، مشکلات اور حل پر مشتمل مستقل کتابیں لکھیں۔ ابو الحسن علی ندویؒ نے مختلف دینی و علمی موضوعات اور عالم اسلام کے تہذیبی و معاشرتی حالات پر جو مضامین، مقالات، تصنیفات اور تالیفات قلم بند کیں، ان کی تعداد بھی سینکڑوں میں ہے۔ جو فکری دنیا میں ارتقاء افکار کے لیے ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انیسویں صدی کا آخر اور بیسویں صدی کا شروع مغربی اقوام کے مادی و سیاسی تسلط اور غلبہ جبکہ مسلمانوں کے ذہنی و فکری غلامی کا دور تھا۔ عالم اسلام کے سوچنے اور اظہار خیال پر مغربیت کا غلبہ چھا گیا اور عالم اسلام کے تمام اہل قلم نے مغربی طرز فکر اور علمی انداز کی نہ صرف حمایت کی، بلکہ پر زور وکالت کی، ایسی صورتحال میں اس بات کی ضرورت تھی کہ اس بات کی تحقیق کی جائے کہ اس انداز فکر سے عالم انسانیت و تمدن اور اقوام و ملل کو کیا کچھ ملا۔ اس ضرورت کے تحت ابو الحسن علی ندویؒ نے عربی زبان میں ایک کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کے نام سے لکھی۔ پھر اس کے بعد قوموں کے حالات زندگی پر ان کی ایک اور تصنیف "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج زوال کا اثر" ہے۔ ہم بھی اسی کتاب کی روشنی میں آنے والے صفحات میں قوموں کے عروج وزوال کا جائزہ لیں گے۔

قوموں کا عروج وزوال

اگر ہم انسانی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ بعثت نبوی ﷺ کے وقت عرب معاشرے کی کیا کیفیت تھی اور نبی کریم ﷺ نے کس طرح اس امت کو پستی سے نکال کر ان کے عروج کو دوام بخشا۔ جب ہم سید ابو الحسن علی ندوی کے افکار کا مطالعہ کرتے ہیں تو انھوں نے قوموں کے عروج وزوال کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" میں نبی کریم ﷺ کا

مقصد بعثت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"آپ کی دعوت اور تربیت نے کس طرح کی امت تیار کی، اس امت کے عقائد و اخلاق اور سیرت و تربیت کیا تھی اس نے کس طرح دنیا کی زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لی، اس کے اقتدار اور امامت کا دنیا کی تہذیبی زندگی اور لوگوں کے رجحانات و کردار پر کیا اثر پڑا، کس طرح دنیا کا رخ ہمہ گیر، خدا فراموشی اور مجموعی جاہلیت سے ہمہ گیر خدا پرستی اور اسلام کی طرف تبدیل ہوا۔ پھر کس طرح اس امت میں انحطاط و زوال کا آغاز ہوا اور اس کو دنیا کی امامت و قیادت سے الگ ہونا پڑا اور کس طرح یہ قیادت کمزور غافل خدا شناسوں کے ہاتھ سے نکل کر طاقتور ناخدا شناس اور مادہ پرست یورپ کی طرف منتقل ہوئی اور خود یورپ میں اس مادہ پرستی اور مذہب بیزاری کا کس طرح ظہور اور ارتقاء ہوا"۔(6)

گویا ہم دیکھتے ہیں کہ قوموں کا متحد رہ کر زندگی گزارنا بہت اہم تصور کیا جاتا ہے اور وہیں سے ان کے عروج و زوال کا پتا بھی چلتا ہے۔ کسی بھی قوم کا تمدن اس قوم کی حیثیت کو بڑے واضح انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس لیے متمدن قوموں نے ریاستی نظام کے تحت زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھا اور کسی بھی ریاستی نظم و نسق میں اس قوم کا سیاسی نظام بہت اہمیت کا حامل تصور کیا جاتا ہے، جس میں نظم حکومت سب سے اہم ہوتا ہے۔

زمانہ جاہلیت کے سیاسی نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا ابو الحسن علی ندوی رقم طراز ہیں۔

"زمانہ جاہلیت میں خالص آمرانہ حکومت کا دور دورہ تھا، اس زمانے کی سیاست مطلق العنان بادشاہت تھی، یہ بادشاہت اکثر مخصوص خاندانوں کی عظمت پر قائم ہوتی تھی جیسا کہ ایران میں تھا۔ وہاں آل ساسان کا یہ عقیدہ تھا کہ حکومت پر ان کا موروثی حق ہے اور انھیں تائید الٰہی حاصل ہے۔ عام رعایا کو بھی پوری کوشش کر کے اس کا یقین دلایا گیا تھا، چناچہ انھوں نے بھی اس اصول کو تسلیم کر لیا تھا اور حکومت کے بارے میں ان کا یہی عقیدہ ہو گیا تھا جو کبھی متزلزل نہ ہو سکا"۔(7)

گویا معلوم ہوا کہ آمرانہ یا مطلق العنان بادشاہت و حکومت کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ اس کا تصور قدیم ادوار سے ملتا ہے۔ جب سے قیادت و سعادت کا سلسلہ شروع ہوا ہے تب سے نظم حکومت میں قیادت مختلف اقسام میں رہی اور رعایا ہمیشہ محکوم طبقے کی صورت میں حکمرانوں کے عتاب کا شکار رہی ہے۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے سید ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں۔

"کبھی بادشاہت کسی خاص گروہ یا کسی مخصوص وطن کا حق سمجھی جاتی تھی جیسا کہ مملکت روما میں اعتقاد تھا وہاں رومی وطن اور رومی قومیت کی عظمت بنیادی قانون تھا، دوسری قومیں اور دوسرے ملک اس قومیت کے غلام

تھے، ان کی حیثیت ان رگوں اور شرائین کی سی تھی جن سے خون جاری ہو کر اپنے مرکز کو پہنچتا ہے، سلطنت روما ہر قانون اور ہر ایک کے حق کو نظر انداز اور ہر ایک کی عزت وناموس پامال کر سکتی تھی۔ وہ ہر ظلم وستم کو جائز سمجھتی تھی رومیوں کا ہم عقیدہ اور ہم مذہب ہو کر اور حکومت کے ساتھ خلوص اور وفاداری کا اظہار کر کے بھی کوئی قوم یا فرد رومیوں کے ظلم وستم سے بچ نہیں سکتا تھا، کسی قوم کو حکومت خود اختیاری یا اندورونی خود مختاری کا حق نہیں تھا اور نہ اس کا موقع تھا کہ اپنے ملک میں اپنے واجبی حقوق سے مستفید ہو سکے، ان محکوم قوموں اور مفتوح ملکوں کی مثال اس اونٹنی کی سی تھی جس پر بوقت ضرورت سواری کی جاتی اور اس کا دودھ دوہا جاتا اور صرف اسی قدر اس کو چارہ دیا جاتا جو اس کی پیٹھ کو مضبوط اور تھن کو دودھ سے بھر ارکھ سکے"۔[8]

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے سلطنت روما کی سیاسی حالت اور ان کے نظم حکومت کا واضح انداز میں نقشہ کھینچا ہے۔ چناچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سلطنت روما میں بادشاہت مخصوص افراد، گروہ یا طبقات کے لیے مخصوص تھی، وہ رعایا کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یورپی اقوام میں بادشاہ کا یہ استحقاق تھا کہ محکوم قوموں سے اپنے حقوق حاصل کریں اور ان استحقاق کا تعین بھی وہ خود کرتے تھے۔ بادشاہ اپنے حقوق کے حصول میں رعایا کے حقوق بھی پامال کر دیتا تھا۔ رعایا کو ان کی بنیادی سہولیات سے محروم رکھا جاتا تھا (ان کو اتنا کچھ دیا جاتا تھا کہ وہ بس زندہ رہ سکیں اور بادشاہوں کی خدمت پر مامور رہیں)۔ رومیوں کی سلطنت کی تباہی کی وضاحت کے لیے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رابرٹ بریفالٹ کا بطور خاص حوالہ دیتے ہیں۔

رابرٹ بریفالٹ (Robert Brifiault) رومی سلطنت کے بارے میں لکھتا ہے۔

"رومی سلطنت کی تباہی کا سبب وہیں کی بڑھی ہوئی خرابیاں (مثلاً رشوت وغیرہ) نہ تھیں بلکہ اصلی برائی اور بنیادی خرابیاں فسادوشر اور حقائق سے گریز کی عادت تھی جو اس سلطنت کے قیام اور نشو ونما میں پہلے ہی دن سے موجود تھی، یہ خرابی سلطنت کے اندر جڑ پکڑ چکی تھی، کسی انسانی جماعت کی تعمیر جب کبھی اس طرح کی کمزور اور کج بنیاد پر کی جائے گی تو اس کے گرنے سے صرف ذہانتیں اور عملی سرگرمیاں نہیں بچا سکتیں اور چونکہ خرابیوں پر ہی اس سلطنت کی بنیاد تھی اس لیے اس کا خاتمہ اور زوال بھی ضروری تھا، کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ رومی سلطنت صرف ایک چھوٹے سے طبقہ کے عیش اور راحت رسان کا ذریعہ تھی اور جمہور عوام سے ناجائز منفعت اندوزی اور عایا کا خون چوس کر شاہی قومیت کو غذا پہنچانا اس حکومت کا کام تھا، بلاشبہ روم میں تجارت امانت داری اور انصاف کے ساتھ جاری تھی اور یہ بات حکومت کی بنیادی خصوصیات میں سمجھی جاتی تھی اور اس سے بھی انکار نہیں کہ حکومت اپنی طاقت وقابلیت میں نیز اپنے عدالتی نظام میں ممتاز تھی، لیکن یہ تمام خوبیاں

حکومت کو تباہی سے نہیں بچا سکتی تھی اور نہ اساسی غلطیوں کے سخت انجام سے محفوظ رکھ سکتی تھیں"۔[9]

اس سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ رومی حکمران رعایا کے حالات کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے، بلکہ رومی معاشرے میں جتنی بھی معاشرتی برائیاں تھیں وہ اس قدر راسخ ہو چکی تھیں کہ ان کے اثرات کلیسا اور مذہبی پیشواؤں تک بھی محسوس کیے جاسکتے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ قوموں کے عروج وزوال میں کسی بھی معاشرے کی معاشرتی حالت کافی حد تک اثر انداز ہوتی ہے اور کسی بھی معاشرے کے بگاڑ میں وہ معاشرتی برائیاں اہم تصور کی جاتی ہیں جو نہ صرف قوموں کے زوال کا سبب بنتی ہیں بلکہ انسانیت کے خاتمے کا بھی سبب بن جاتی ہیں، کیونکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ معاشرے کی تعمیر وترقی میں حسن انسانیت بہت اہم ہے۔ کسی بھی قوم کی پہچان اس قوم کی اقدار سے ہوتی ہے جب بھی کسی قوم سے ان اقدار کا زوال شروع ہو وہ قوم زوال کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ اقدار میں اخلاقیات بہت اہم تصور کی جاتی ہیں اور کسی بھی معاشرے میں اخلاق و سیاست کا بہت اہم مقام ہے اور یہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم تصور کیے جاتے ہیں۔ اگر کسی قوم میں اخلاقی اقدار ناپید ہو جائیں تو وہ قوم سیاسی پستی میں چلی جاتی ہے اور اس میں رعایا کے حقوق کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ڈاکٹر الفرڈ بٹلر کا بطور خاص حوالہ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر الفرڈ بٹلر (Alfred Butler) رومی حکومت کے بارے میں لکھتا ہے۔

"مصر میں رومی حکومت صرف ایک ہی غرض وغایت اپنے سامنے رکھتی تھی اور وہ یہ تھی کہ جس طرح ممکن ہو رعایا سے مال لوٹ کھسوٹ کر حکام کو فائدہ پہنچایا جائے، رعایا کی بہبودی اور خوشحالی اور عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے کا خیال تک نہیں آتا تھا، رعایا کی تہذیب اور اخلاق کو درست کرنا اور ترقی دینا تو بڑی چیز ہے، ملک کے مادی وسائل کو ترقی دینے کی بھی اس کو فکر نہ تھی، مصر پر ان کی حکومت ان پردیسیوں کی سی حکومت تھی جو صرف اپنی طاقت پر بھروسہ کرتی ہے اور محکوم قوم کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے تک کی بھی ضرورت نہیں سمجھتی"۔[10]

گویا معلوم ہوا کہ اہل روما کے ہاں حکمران طبقہ رعایا سے مختلف صورتوں میں مال لینا چاہتا تھا اور اس کے بدلے میں رعایا کی خوش حالی کے بارے میں سوچنا ان کے لیے معیوب سمجھا جاتا تھا۔ حکمران ملک کے مادی وسائل پر قابض رہ کر ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے اور اس کے مقابلے میں عوام سے ہمدردی تک نہیں کی جاتی تھی۔ چنانچہ چند افراد کی خاطر اجتماعیت کو نظر انداز کیا جاتا تھا جس سے اجتماعیت زوال پذیر ہو

جاتی تھی، اس لیے اجتماعیت کی پستی دراصل اقوام کی پستی شمار کی جاتی رہی ہے۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے کہ

"یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی اجتماعی ادارہ زوال پذیر ہوتا تو اس کے چلانے والے اس کی حرکت اور ارتقاء کو روک دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں پاتے، اسی لیے رومی معاشرہ (اپنے انحطاط کے دور میں) سخت درجہ کی ظالمانہ طبقہ واریت کے شکنجہ میں کسا ہوا تھا معاشرے میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اپنا پیشہ بدل سکے۔ ہر لڑکے کے لیے ضروری تھا کہ اپنے باپ کا پیشہ اختیار کرے"۔(11)

گویا اس سے معلوم ہوا کہ معاشرتی اداروں کی بربادی نیچے سے شروع ہو کر اوپر کی طرف جاتی ہے پھر اس بربادی کو حکمران بھی نہیں روک سکتے تھے جب تک کہ ایک معیاری معاشرے کی بنیاد نہ ڈالی جائے۔ معاشرے میں ان بنیادی اقدار کا پروان چڑھانا بھی ضروری ہے جو کسی بھی معاشرے کی تعمیر و ترقی میں بنیادی عناصر کا کام کرتی ہیں۔ جس طرح کسی پودے کی بہتر نشو نما کے لیے ہوا پانی اور آکسیجن ضروری ہے اسی طرح معاشرے کی تعمیر و ترقی کے لیے اخلاقی اقدار کا ہونا ضروری ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رومی سلطنت کے نظم حکومت کے حوالے سے لکھتے ہیں

"اس عیش پسند اور مسرفانہ زندگی کا لازمی نتیجہ تھا کہ ٹیکسوں میں اس قدر اضافے ہو جائیں جو رعایا کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوں، نئے نئے قوانین بنائے جائیں۔ جن کی رو سے کسانوں، تاجروں، کاریگروں اور اہل حرفہ سے زیادہ سے زیادہ مال گھسیٹا جا سکے نوبت یہاں تک پہنچی کہ آئے دن کے ان اضافوں اور بھاری بھاری ٹیکسوں نے رعایا کی کمر توڑ دی اور حکومت کے مطالبات سے ان کی پیٹھ بوجھل ہو گئی"۔(12)

یہ اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ رعایا سے جتنا مال ہو سکے وصول کیا جائے تاکہ وہ معاشی تنگ دستی میں رہے اور حکمران اپنی عیاشیوں کے ساتھ حکومت کو چلا سکیں اور ریاستی نظم و نسق میں کوئی ان سے پوچھنے والا نہ ہو۔ یہی حالات ہمیں آج اپنے وطن عزیز میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں کہ حکمران آئے دن عوام پر بھاری بھرکم ٹیکس لاگو کرتے رہتے ہیں اور عوام کا پیسہ وائٹ کالر جرائم میں لگا دیتے ہیں۔ عوام کا پیسہ عوام پر خرچ کرنے کی بجائے اپنی جیبوں میں ڈال لیتے ہیں، اس لیے ہمیں سوئس بنکوں میں پڑے ہوئے ڈالر نظر آتے ہیں یا پھر منی لانڈری کی مثالیں سامنے ہیں جن کے تانے بانے حکمران طبقوں سے ملتے نظر آتے ہیں۔

عوام پر بے جا ٹیکسوں کی وضاحت کرتے ہوئے ایران بعہد ساسانیاں کا مولف لکھتا ہے۔

"باقاعدہ ٹیکسوں کے علاوہ رعایا سے نذرانے لینے کا بھی دستور تھا جس کو آئین کہتے تھے، اسی آئین کے مطابق

عید نوروز اور مہر گان کے موقعوں پر لوگوں سے جبراً تحائف وصول کئے جاتے تھے، خزانہ شاہی کے ذرائع آمدنی اور وہ ذرائع تھے جو بادشاہ کے لئے حقوق خسروی کے طور پر مخصوص تھے، مثلاً فارنگیوں)علاقہ آرمینیہ(کی سونے کی کانوں کی ساری آمدنی بادشاہ کی ذاتی آمدنی تھی"۔ (13)

گویا ان حالات سے واضح طور معلوم کیا جا سکتا ہے کہ رومی حکمران اپنی رعایا کے ساتھ ناروا سلوک کرتے تھے، حالانکہ کسی بھی ریاست میں حاکم کا کام رعایا کی دیکھ بھال کرنا ہوتا ہے تاکہ رعایا خوشحال رہے اور ملکی نظم و نسق آسانی سے چلتا رہے۔ مگر اہل روما کے ہاں اس کے برعکس ہمیں شواہد ملتے ہیں، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہر دور میں جمہوری ریاستوں کا یہ شیوہ رہا ہے کہ عوام کو محکوم بنا کر ان کو معاشی تنگ دستی میں ڈالا جائے تاکہ ان کو ریاستی نظم و نسق اور حکمرانوں کی پالیسیوں کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہ ملے۔ وطن عزیز پاکستان میں بھی حکمران ہمیشہ آئین کی بالا دستی کی باتیں کرتے رہتے ہیں جہاں ان کے مفاد ہوں وہیں ان کو آئین نظر آجاتا ہے جہاں عوام کے مفادات کی باتیں ہوں وہاں ان کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ آئین دراصل وہ قانون ہے جس کے مطابق ریاست کو چلایا جاتا ہے اور ریاست کا تصور رعایا سے مکمل ہوتا ہے، اس لے رعایا کے مفاد کے لیے جب بھی ضروری ہو آئین میں تبدیلی کر دینی چاہیے کیونکہ آئین بھی انھی حکمرانوں کا بنایا ہوا ہے۔ لہذا اب وقت آگیا ہے کہ آئین و قانون کی حقیقی معنوں میں بالا دستی قائم ہو اور رعایا کو خوش حال کیا جا سکے۔

محمد علی کرد نے خطط الشام میں رومیوں کے سیاسی طرز کا اور ان کی پالیسیوں کا خلاصہ یوں بیان کیا ہے کہ:

"اچھا گلہ بان وہ ہے جو اپنی بھیڑوں کا اون کاٹ لیتا ہے نوچتا نہیں" واقعہ یہ ہے کہ دو صدیاں گزر گئیں اور شہنشاہان روم اپنی مملکت کے باشندوں کا اون کاٹتے رہے (نوچنے کی کوشش نہیں کی) وہ ان سے بہت بڑی دولت وصول کرتے رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بیرونی دشمن سے ان کی حفاظت کرتے رہے"۔ (14)

یہی حالات ہمیں عین پاکستان میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں، جہاں پاکستان کو آزادی حاصل کیے ۶۸ برس ہو گئے ہیں مگر عوام کبھی خوش حال نہیں ہو سکی اور نہ غربت کی سطح کو کم کیا جا سکا ہے۔ بلکہ تبدیلی ایام کے ساتھ ساتھ غربت، مہنگائی اور بے روزگاری میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور حکمران طبقہ عوام کا پیسہ جمع کر کے بیرون ممالک اپنی دولت جمع کرتے رہے ہیں، ٹھکانے بناتے رہے ہیں اور اپنی عیاشیوں پر عوام کا پیسہ خرچ کرتے رہے ہیں۔ پاکستان میں اتنے برے حالات پیدا کر دیے گئے ہیں کہ عوام اپنا تن من دھن بیچنے پر مجبور ہو گئے، اس کے باوجود کہ تاریخ اسلام میں ہمارے لیے سنہری ہدایات اور تعامل موجود ہے، جس کی روشنی میں ہم اپنے ملکی

نظم و نسق کو بہتر سے بہتر بنا سکتے ہیں۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ

"ساتویں صدی مسیحی میں روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی جو مزاج کے اعتبار سے صالح کہی جا سکے اور نہ کوئی ایسی سوسائیٹی تھی جو جو شرافت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کی حامل ہو، نہ ایسی کوئی حکومت تھی جس کی بنیاد عدل و انصاف اور رحم پر ہو اور نہ ایسی قیادت تھی جو علم و حکمت اپنے ساتھ رکھتی ہو اور نہ کوئی ایسا صحیح دین تھا جو انبیاء کرام کی طرف صحیح نسبت رکھتا ہو اور ان کی تعلیمات و خصوصیات کا حامل ہو، اس اندھیرے میں کہیں کہیں عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں اگر کبھی کچھ روشنی نظر آجاتی تھی تو اس کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے برسات کی اندھیری رات میں جگنو چمکتا ہے"۔(15)

گویا یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ قوموں کا عروج ان کی اخلاقی اقدار کی بلندی سے ہوتا ہے اور قوموں کا زوال ان کی اخلاقی پستی سے شروع ہوتا ہے۔ اخلاقی اقدار میں وہ تمام ایسے امور ہو سکتے ہیں جو شرف انسانیت کی بنیاد بنتے ہیں، جن میں قیادت و سعادت، اخوت مساوات، رواداری، عدل و انصاف، لوگوں سے حسن سلوک اور معاشی تفاوت وغیرہ جبکہ اخلاقی پستی میں حقوق کا بے جا استعمال، حقوق کی پامالی، طبقاتی تقسیم، غیر معیاری رویے، محکوم رعایا پر ظلم و ستم، معاشرتی برائیوں جیسے ظلم، عداوت اور ادب و احترام کا مفقود ہونا وغیرہ۔ چناچہ جب تک قومیں اپنا معیار زندگی اپنی اصل بنیادوں پر استوار نہیں کریں گی عروج و زوال کی اس کشمکش میں مبتلا رہیں گی۔ ہر قوم کو اپنے مقاصد متعین کر کے ان کے مطابق زندگی کا لائحہ عمل ترتیب دینے کی بھی ضرورت ہے، اگر ہم اغیار کے مقاصد کے تحت اپنی زندگی کی راہیں متعین کریں گے تو پھر زوال کی پستیوں میں رہ کر عروج کے خواب دیکھتے رہیں گے۔

لہذا اب ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ مغربی گرداش سے نکل کر اپنی اعلیٰ اسلامی اقدار کو اپنایا جائے۔ وہ اعلیٰ اخلاقی اقدار جنھوں نے انسان کو معزز و مکرم بنایا اور قوموں کو یکجا کر کے وحدانیت کا درس دیا۔ اتحاد و یکجہتی قوموں کے عروج کا بنیادی سبب ہے اس لیے اسلامی تعلیمات میں اس کی بار بار تعلیم دی گئی اور اسلامی تمدن میں ہمیں اس کی واضح مثالیں بھی ملتی ہیں۔ جب بھی کسی قوم نے ان اقدار کو اپنایا وہ وہ اعلیٰ و ارفع کہلائی۔

اسلامی اقدار اور اسلامی تمدن کے اثرات کے حوالے سے سید ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

"یورپ کی مذہبی تاریخ اور مسیحی کلیسا کی سرگزشت کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اسلام کے ذہنی

اثرات کے اور بھی بہت سے نمونے اور نظیریں ملیں گی۔ خود لوتھر کی مشہور اصلاحی تحریک اپنے نقائص کے باوجود اسلام سے متاثر تھی اور مؤرخین کو اس کا اعتراف بھی ہے کہ اس کے بانی پر اسلامی تعلیمات کے اثرات پڑے تھے اور صرف مذہب ہی نہیں بلکہ یورپ کی پوری زندگی اور اس کا تمدن اسلام سے متاثر ہوا ہے"۔[16]

اگر ہم بغور جائزہ لیں تو ہندوستان کی قوموں کے اخلاق و معاشرت اور سیاست و معیشت میں بھی اسلامی شریعت کے اثرات نظر آئینگے، خواہ اس کا تعلق بنیادی انسانی حقوق سے ہو، صنف نازک کا احترام ہو اور معاشرتی طبقات میں اصول مساوات وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اصول برصغیر میں مختلف اقوام کے باہمی اختلاط کی وجہ سے اور بھی زیادہ تسلیم کیے جانے لگا۔ اور یہ اسلام کی عظمت کا اظہار ہے کہ اس نے سب سے پہلے شرف انسانیت کی بات کی اور عورت کو وہ بلند مقام دیا جس کا پہلے کسی معاشرے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مختلف اقوام اور ان کے تمدن پر گہرے نقش ثبت کیے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ آباد دنیا کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن بعثت محمدی ﷺ اور ظہور اسلام کے بعد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں سے قطعاً متاثر نہیں ہوا۔

یورپ کا احوال بیان کرتے ہوئے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ

"یورپ کی قوموں اور سلطنتوں نے اپنے آپ کو ایک مستقل دنیا فرض کر لیا ہے۔ قدرت نے پہاڑوں اور دریاؤں کے جو طبعی حدود قائم کر دیے ہیں اور خود انہوں نے اپنے گرد سیاسی مقصد اور استعمار کے جو چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچ لیے ہیں ان کے نزدیک ان کے باہر دنیا اور انسان کا وجود نہیں پایا جاتا، ان کو ان گھروندوں کے باہر کسی چیز کا احترام اور قدر نہیں، انہوں نے خود اپنے آپ کو ایک مستقل معبود بنا لیا ہے اور عبادت و تقدیس کا جتنا تعلق عبد و معبود کے درمیان ہونا چاہیے انہوں نے اس خود ساختہ معبود کے ساتھ قائم کر لیا"۔[17]

یہ ایک بنیادی بات ہے کہ ہر قوم کی ان کے رتبے کی بنیاد پر عزت و احترام کیا جائے اور آج کے اس دور میں سرحد بندیاں صرف پہچان اور خود مختاری کے لیے ہیں بحیثیت انسان دوسروں کا احترام اتنا ضروری ہے جتنا خود اپنا احترام چاہیے۔ دوسرا چاہیے کسی دوسرے مذہب کا فرد ہو، کسی دوسری سرحد کا فرد ہو یا کسی دوسرے تمدن کا فرد ہو، قوم مذہب اور تمدن کو بالائے طاق رکھ کر بحیثیت انسان عزت و احترام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قومیں عروج حاصل کرتی ہیں جو ان بنیادی اصولوں کا احترام کرتی ہیں اور جس سے امن و وحدت کی فضا قائم ہوتی ہے۔ لہذا قوموں میں تحمل و برداشت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر

انسان کی عزت و احترام کیا جائے۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مغربی قیادت کے اثرات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"اخلاقی و دینی تعلیمات سے محرومی اور صدیوں کی بے تربیتی کے ساتھ علم و صنعت اور تحقیق و اکتشافات کی ترقی سے قوت و اخلاق میں کوئی توازن باقی نہیں رہا۔ انسانوں نے پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنا، مچھلیوں کی طرح پانی میں تیرنا سیکھ لیا لیکن آدمیوں کی طرح زمین پر چلنا بھول گئے۔ بے قید اور بے شعور عقل و علم نے ہر رہزن اور قفل شکن کو قفل شکنی کا آلہ اور ہر بدمست کو تلوار مہیا کی، سائنس نے بیسویں صدی کے شریر اور نادان بچوں کو کھیلنے کے لیے بھی دھار دار اور خطرناک اوزار تقسیم کیے جن سے وہ اپنے آپ کو بھی اور اپنے بھائیوں کو بھی زخمی کر رہے ہیں۔ بالآخر اندھی بہری سائنس نے "ذراتی اور ہیڈروجن بم" کی شکل میں انسانوں کے ہاتھ میں خود کشی کا ہتھیار دے دیا۔ ان لادینی قوموں کے عہد اقتدار میں انسان اس مذہبی خاصہ سے محروم ہونے لگا جو اسے دوسرے انسانی حواس کے ساتھ مشرق کی ہزاروں سال کی زندگی میں لازمۂ زندگی رہا ہے، خدا طلبی کے عمومی ذوق کی جگہ دنیا طلبی کے بحران نے لے لی، اخلاق و معنویات اور حقیقی انسانی صفات، و کمالات میں سخت انحطاط اور تنزل ہوا، غرض لوہے اور دھات کو ہر طرح ترقی ہوئی اور "آدمیت" کو ہر طرح زوال ہوا"۔ (18)

معاشرتی زوال کا ایک بنیادی سبب قوم پرستی کا رجحان بھی ہے، وہ قومیں کبھی ترقی نہیں کر سکتیں جو قوم پرستی میں مبتلا ہو جاتی ہیں قوم پرستی سے معاشرتی تفاوت ختم ہو جاتا ہے اور معاشرتی بگاڑ شروع ہو جاتا ہے جس سے معاشرے کا امن و سکون ختم ہو جاتا ہے۔ قوم پرست قوموں سے کبھی بھی اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ متحد رہتے ہوئے ظلم و ستم نہیں کریں گی اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ان کی تحقیر نہیں کریں گی۔

لہذا مولانا سید ابو الحسن علی ندوی قوم پرستی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"قوم پرستی کا تخم ایک ہی طرح کے برگ و بار لاتا ہے، یہ ممکن نہیں کہ کوئی قوم قوم پرستی پر ایمان رکھتی ہو اور دست درازی نہ کرتی ہو یا نہ کرنا چاہتی ہو، اور اپنے سوا دوسروں کی تحقیر و تنقیص سے پاک ہو"۔ (19)

قوم پرستی کے عناصر نفرت اور خوف کے حوالے سے مولانا ابو الحسن علی ندوی رقم طراز ہیں:

"نفرت اور خوف قوم پرستانہ زندگی کے ضروری عناصر ہیں جن کے بغیر اس میں جان نہیں آتی، قوم پرستی کا جوش اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا اور اگر پیدا ہو جائے تو باقی نہیں رہتا جب تک کہ قوم کے لیے کوئی چیز نفرت کرنے کے لیے اور کچھ ڈرنے کی لیے نہ ہو، چنانچہ قومی رہنما، نفرت اور خوف کے ذریعہ سے اس کے جذبات

برانگیختہ کرتے رہتے ہیں اور اس کی اس دکھتی رگ کو دبا کر اس میں ہیجان واشتعال اور جوش وخروش پیدا کر دیتے ہیں، وہ نفرت اور خوف کی آگ بجھنے نہیں دیتے بلکہ رائی کا پہاڑ بنا کر، چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بڑھا کر اور کسی نہ کسی حقیقی یا فرضی حریف کو سامنے لا کر قوم کے جذبہ نفرت وخوف کو زندہ اور متحرک رکھتے ہیں اور اسی میں اپنی حکومت یا قیادت کی زندگی اور اپنی بقا سمجھتے ہیں"۔[20]

اس سے معلوم ہوا کہ قومی رہنما اپنے قول و فعل کے ذریعے قوموں میں نفی جذبات ابھارتے ہیں۔ قوموں میں قوم پرستی کے جذبات کو ابھار کر ایک دوسرے کے خلاف نفرتوں کے بیج بوتے ہیں۔ یہ نفرت ایک ایسی چنگاری ہے جو فرد واحد سے شروع ہو کر پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ پروفیسر جوڈ نے اس کی توجیہ کی ہے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس کا حوالہ دیتے ہیں۔

پروفیسر جوڈ نے قوم پرستی کی جو فلسفیانہ اور نفسیاتی تحلیل وتوجیہہ کی ہے۔ وہ حسب ذیل ہے۔

"وہ مشترک جذبات جن کو آسانی سے برانگیختہ کیا جا سکتا ہے اور جو جمہور کی بڑی بڑی جماعتوں کو حرکت میں لا سکتے ہیں وہ رحم فیاضی اور محبت کے جذبات نہیں بلکہ نفرت اور خوف کے جذبات ہیں جو لوگ کسی قوم پر کسی مقصد کے لئے حکمرانی کرنا چاہتے ہیں وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک اس کے لیے کوئی ایسی چیز تلاش نہ کر لیں جس سے وہ نفرت کرے اور اس کے لیے کوئی ایسی شخصیت یا قوم نہ پیدا کر لیں جس سے وہ ڈرے"۔[21]

گویا اس وقت عالم اسلام کی جو کیفیت ہے اس پر غور کیا جائے تو پروفیسر جوڈ کے خیالات کی عملی تکمیل دیکھنے کو ملتی ہے، کیونکہ اس خطے میں ایسی شخصیت بھی پیدا کی گئی، ادارے بھی وجود میں لائے گئے اور حالات بھی ایسے پیدا کیے گئے جس سے خوف اور نفرت کی فضا پیدا کر کے اپنے مقاصد حاصل کیے جا سکیں اور ان اقوام کو محکوم بنایا جائے۔ جس کے متعلق کافی کچھ سوچنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں دیکھنے میں آیا ہے کہ مغرب کے لیے ایک وقت میں کوئی چیز بہت اہم اور پسندیدہ ہوتی ہے جبکہ وہی چیز دوسرے وقت میں اس کے لیے عام اور باعث نفرت بن جاتی ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ در اصل یہ ہے کہ اس دوران ان کے مقاصد بدل جاتے ہیں اور تبدیلی مقاصد کے ساتھ ان کی عملی کام بھی بدل جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا رجحان ہے جس کے بارے میں نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام کو بھی سوچنے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک قوم پرستی کا سوال ہے تو اسلام اس قوم پرستی کو (جو اپنی قوم کے جا و بے جا پاسداری اور دوسروں سے نفرت اور خوف کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی اور جس میں اصول وصداقت کا سوال نہیں)

"عصبیت" اور "حمیت جاہلیت" قرار دیتا ہے اور ہر ایسی امداد وحمایت وجوش وحمیت اور جنگ وجدال کو حرام قرار دیتا ہے جس کی بنیاد محض قومی یا جماعتی عصبیت پر ہو، رسول اللہ ﷺ نے صاف صاف ارشاد فرمایا:

عن جبیر بن مطعم ان رسول اللهﷺ قال:ليس منامن دعا الى عصبية، وليس منا من قاتل على عصبية، وليس منامن مات على عصبية۔[22]

"وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو کسی جتھ بندی کی دعوت دے، وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو کسی جتھ بندی اور پاسداری کے لیے جنگ کرے، وہ شخص ہم میں سے نہیں جو جتھ بندی کی حالت میں مرے"۔

جو شخص اس قوم پرستی اور جاہلی عصبیت کی جنگ میں مارا جائے اس کی موت "جاہلی" (غیر اسلامی) قرار دی گئی ہے اور ایک حدیث میں اس کو امت سے خارج بتلایا گیا ہے۔

ومن قاتل تحت رأية عمية يدعواالىٰ عصبية اويغضب لعصبية فقتل فقتلته جاہلية۔[23]

"جو شخص عصبیت کے جھنڈے تلے لڑے اور لوگوں کو عصبیت کی طرف بلائے یا اس کا غصہ عصبیت کی وجہ سے ہو، پھر وہ مارا جائے گا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہو گی"۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قوم پرست حکومتوں کا معیارِ عزت وعظمت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قوم پرست حکومتوں کا معیار عزت وعظمت یہ ہے کہ زمین کے بڑے بڑے رقبہ پر ان کا تسلط واقتدار ہو، ملک کے حدود وسیع اور ذرائع آمدنی وافر ہوں، اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کرنے اور ہمسایہ قوموں، یا حریف سلطنتوں کو خوف زدہ کرنے کا ان کے پاس پورا سامان ہو، ملک کے افراد میں قومی برتری، نسلی تفوق، اپنی قدیم تہذیب اور ادب وزبان اور تاریخ ماضی پر فخر ومباہات کا جذبہ پایا جاتا ہو اور دوسری معاصر قوموں کی کمزوری اور تہذیبی وادبی بے مائیگی پر ایمان راسخ ہو، وہ ملک وسلطنت کی عزت وعظمت کی خاطر بڑے بڑے مجرمانہ ووحشیانہ اعمال کا بے تکلف ارتکاب کر سکتے ہوں، اور اپنی قوم اور اس کے افراد کو حقیر سے حقیر فائدہ پہنچانے کے لئے بڑی سے بڑی حق تلفی اور ناانصافی میں ان کو باک نہ ہو، ایسی حکومت کا اخلاقی معیار خواہ کتنا ہی پست ہو، اس کے شہری، اخلاقی شعور، انسانیت کے احترام، اصولوں کی پابندی سے خواہ کتنے ہی بیگانہ ہوں اور وہ حکومت اور اس کے ذمہ دار اخلاقی حدود وقیود سے کتنے ہی آزاد ہوں وہ حکومت عزت وعظمت کے بلند معیار پر فائز اور دنیا کی ایک خاص قابل احترام اور لائق تقدیس حکومت ہے"۔[24]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ پروفیسر جوڈ نے بھی اس کو درست انداز میں سمجھا وہ لکھتے ہیں کہ:

"قومی عظمت کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ قوم کے پاس ایسی طاقت ہو جس سے وہ بوقت ضرورت اپنی خواہش اور ارادہ کو دوسروں پر مسلط کر سکے، یہ قومی عظمت ان قوموں کے نزدیک آئیڈیل کا درجہ رکھتی ہے، اس کی نامعقولیت اسی سے ظاہر ہے کہ یہ معیار اخلاقی صفات کے بالکل ضد ہے، اگر کوئی ملک ایسا ہے جو صرف سچ ہی بولتا ہے، وعدے وفا کرتا ہے اور کمزوروں کے ساتھ انسانیت کا سلوک کرتا ہے تو ان قوموں کے نزدیک اس کی عزت کی سطح پست ہے، مسٹر بلڈون کے بقول "عزت نام ہے اس وقت کا جس سے قوم خاص شرف واعتبار کی مالک ہو اور نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرے" اور ظاہر ہے کہ ایسی قوت جس سے قوم کو ایسا اعزاز وامتیاز حاصل ہو موقوف ہے آتش فشاں گولوں اور بموں پر، ان نوجوانوں کی وفاداری اور وطن دوستی پر جن کا شہروں پر ان گولوں اور بموں کو پھینکنا محبوب مشغلہ ہے، پس جس عزت کے لئے کسی قوم کی تعریف کی جاتی ہے وہ ان صفات واخلاق کی بالکل ضد واقع ہوئی ہے جن کی بنیاد پر فرد کی تعریف کی جاتی ہے، میرے نزدیک تو قوم کو اسی قدر وحشی اور غیر مہذب سمجھنا چاہئے جس قدر وہ ایسی عزت کی مالک ہو، فریب دہی، دغابازی اور ظلم سے عزت حاصل کرنا کسی انسان اور قوم کے لئے قطعاً باعث عزت نہیں ہے"۔[25]

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ قوموں کا معیار زندگی ان کے تمدن اور طرز سیاست سے معلوم کیا جاتا ہے، تمدنی زندگی میں امن وامان کا قیام ایک بنیادی عنصر تصور ہوتا ہے۔ جو قومیں قتل وقتال کو پسند کرتی ہیں اور دوسری اقوام کو اسلحہ اور جنگ کی بنیاد پر فتح کرنا چاہتی ہیں، وہ بظاہر جتنی کامیاب ہو جائیں مگر حقیقت میں وہ پستی میں رہتی ہیں، کیونکہ قوموں میں عروج تمدن معاشرتی زندگی میں بہتری سے آتا ہے جب ان کے معاملات ٹھیک ہو جاتے ہیں اور اخلاقی اقدار کا فروغ ہوتا ہے، صبر و تحمل جیسی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں تب وہ قومیں ترقی کرتی ہیں۔ یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ جب کوئی قوم معاشرتی اور تمدنی زندگی میں عروج حاصل کرتی ہے وہ عالمی سطح پر بھی اپنی خوبیوں کی وجہ سے نام پیدا کر لیتی ہے اور جب کسی قوم کا نام بلند ہو جائے تو گویا اس نے اپنا مقام حاصل کر لیا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قوموں کے تنزل کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قانون، مطابع اور حکومت کا محکمہ احتساب جہاں سیاسیات وانتظامات میں نہایت ذکی الحس، خوردبین اور سخت گیر ہوتا ہے اور کسی ادنیٰ تنقید کو بھی بعض اوقات گوارا نہیں کرتا، وہاں اخلاقیات کے بارے میں نہایت فراخ دل، فیاض اور بے نیاز واقع ہوتا ہے، غیر ذمہ دار اخبار نویس، فحش نگار ادیب اور افسانہ نگار اپنے حقیر مادی فوائد کے لئے قوم میں اخلاقی طاعون پھیلاتے ہیں لیکن جب تک پانی سر سے نہ گزر جائے حکومت کی مشین متحرک

نہیں ہوتی، اس طرز حکومت میں اخلاق کے ساتھ قوم کی صحت بھی محفوظ نہیں رہتی"۔[26]

یہ ایک بنیادی بات ہے جس کی طرف مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے نشاندہی کی ہے کیونکہ کسی بھی ریاستی نظام کو سمجھنے کے لیے اور لوگوں کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے کچھ بنیادی ادارے قائم کیے جاتے ہیں جن میں قانون بنانے واے، قانون کا نفاذ کرنے والے اور محکمہ احتساب قابل ذکر ہیں۔ جن کا بنیادی کام ریاستی نظم و نسق کی دیکھ بھال ہوتا ہے۔ ان اداروں میں زیادہ نفاذ قانون پر توجہ دی جاتی ہے۔ لوگوں کا معیار زندگی کیسا ہے اور انھیں کن بنیادوں کی طرف توجہ دے کر عوام کی اصلاح کرنی چاہیے، افسوس کہ اس طرف بھی توجہ نہیں دی جاتی ہے اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اقوام میں اس معاشرے کے بنیادی ٹول جو عوام الناس کی بہتر انداز میں تربیت اور آگاہی دے سکتے ہیں وہ اخلاقی قدروں سے ماوراء ہو جاتے ہیں جن میں ذرائع ابلاغ ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے جس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے نزدیک قوموں کی ترقی کا راز صنعتی میدان میں ترقی کرنے میں ہے، وہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ قومیں زیادہ ترقی کرتی ہیں جو اپنے وسائل کو وقتی تناصر کے تحت واستعمال کرتی ہیں اور زمانی تعمیرات میں یہ موجود ٹیکنالوجی کا استعمال کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر انسان زمانہ قدیم میں پیدل چلتا تھا، پھر یہ بات اس کی سمجھ میں آئی کہ وہ جانوروں سے فائدہ اٹھائے، اس نے بیل گاڑیوں سے کام لیا، پھر اس نے سرعت پیدا کرنی چاہی، تو اس نے صبا رفتار گھوڑوں کے ذریعہ دنوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کی، انسان کی فطرت میں قناعت اور سکون نہیں اور جذبہ مسابقت بھی اس کو کسی ایک منزل پر ٹھہرنے نہیں دیتا، اس کی ضروریات بھی بڑھتی گئیں اور راحت و سرعت کا معیار بھی بلند ہوتا گیا اور بتدریج وہ سواریاں وجود میں آتی رہیں جن میں سے ہر ایک پہلے کے مقابلے میں زیادہ تیز ہے، بحری سفر میں اس نے بادبانی کشتیوں سے جہازوں تک ترقی کی، حمل و نقل کے بری و فضائی آلات و وسائل بھی اس نقطہ تک پہنچ گئے جو زمانہ سابق کے لوگوں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔ اگر صحیح مقاصد کے ماتحت ان سہولتوں سے فائدہ اٹھایا جائے غیر ضروری مشقت اور وقت اور قوت کے غیر ضروری استعمال سے بچ کر ان کو اور کسی بہتر مصرف میں صرف کیا جائے تو یہ خدا کی نعمت ہے"۔[27]

مغربی قوتیں مدت دراز سے یہ عقیدہ رکھتی ہیں کہ لذت وراست، مادی انتفاع، سربلندی اور غلبہ کے علاوہ دنیا میں کوئی اور قابل حصول مقصد نہیں ہے طبعی طور پر انہوں نے اپنی ساری قوت علم اور ذہانت کو ان مقاصد کے حصول میں صرف کیا اور ایسے آلات و وسائل ایجاد کئے جن سے یہ مقاصد زیادہ آسانی اور سرعت

کے ساتھ حاصل ہو سکیں، رفتہ رفتہ وسائل خود مقاصد بن گئے اور اختراع وایجاد اپنی جگہ پر خود ایک بڑا مقصد قرار پا گیا، اور جس طرح بچوں کو کھلونوں سے دلچسپی ہوتی ہے اسی طرح ان کو ایجادات واختراعات سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ یورپ میں معیار بدلتے رہے ہیں کچھ مدت پہلے یہ خیال غالب تھا کہ تمدن نام ہے راحت کا، اور راحت زندگی کا سب سے بڑا آئیڈیل تھا، پھر مختلف محرکات واسباب کی بنا پر اور کچھ حصول راحت کے لئے سرعت وتیز رفتاری کی کوشش کی گئی اور زندگی کے ہر شعبہ میں سرعت پیدا کرنے کا مقابلہ شروع ہوا، لوگ اس میں ایسے محو ہوئے کہ رفتہ رفتہ یہ سمجھنے لگے کہ تمدن نام ہی ہے سرعت کا، اب سرعت زندگی کا آئیڈیل بن گیا۔

قوموں کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کس حد تک ضروری ہے اس حوالے سے پروفیسر جوڈ لکھتا ہے۔

"بلاشبہ ہم بڑی سرعت وتیز رفتاری سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کر سکتے ہیں، لیکن یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ جن مقامات کا ہم سفر کرتے ہیں وہ بہت کم اس قابل ہیں کہ ان کی طرف سفر کیا جائے اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاحوں کے لیے زمین سمٹ گئی ہے اور اس کی طنابیں کھنچ گئی ہیں، قومیں ایک دوسرے کے قریب ہو گئی ہیں اور ان کے پاؤں ایک دوسرے کی دہلیز پر ہیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوموں کے آپس کے تعلقات پہلے سے زیادہ ناخوشگوار وناشگفتہ ہیں، وہ وسائل جن سے ہم اپنے ہمسایہ قوموں سے براہ راست واقف ہو جاتے ہیں انہوں نے الٹا دنیا کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا، ہم نے آواز پہنچانے کا آلہ ایجاد کیا اور اس کے ذریعہ اپنی ہمسایہ قوموں سے باتیں کیں، لیکن اس کا انجام یہ ہے کہ آج ہر قوم ہوا کی پوری طاقت کے ساتھ اپنی ہمسایہ قوم کو چھیڑنے اور وق کرنے کا کام لے رہی ہے، وہ اس کوشش میں رہتی ہے کہ وہ دوسری قوم کو اپنے سیاسی نظام کی برتری کا قائل ومعتقد بنا دے"۔ (28)

مغربی قوموں میں خیر کی طرف میلان اور بھلائی کا رجان بہت کم ہو گیا ہے اور اخلاق وتمدن کے صحیح اصول ومبادی کا سر رشتہ ان کے ہاتھ سے مدت ہوئی چھوٹ گیا، غیر ذمہ وار ادب نے دلوں میں کجی اور ملحدانہ فلسفہ نے طبیعتوں میں انحراف پیدا کر دیا اور ذوق فاسد ہو گئے، اس بنا پر جس طرح سے سمیا ور وبائی امراض میں صالح سے صالح غذا مریض کے معدہ میں پہنچ کر مسموم اور فاسد ہو جاتی ہے، اسی طرح علوم اور صنعتیں ایجادات واکتشافات اور علمی ترقیاں یورپ میں خود اہل یورپ کے لئے اور عام انسانیت وتہذیب کے لئے وبال جان بن گئی ہیں، مسٹر ایڈن نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا:

"جب تک کچھ کیا جائے اور خبر لی جائے اس دنیا کے باشندے اس صدی کے پچھلے حصے میں غاروں میں زندگی گزارنے والے دنیا کے قدیم وحشیوں کا طرز زندگی اختیار کرلیں گے اور اسی وحشت وبربریت کا دور شروع ہوجائے گا جو ہزاروں سال پہلے دنیا میں قائم تھا، کیسی عجیب بات ہے کہ تمام ممالک ایک ایسے ہتھیار سے بچنے کے لئے کروڑوں روپیہ صرف کررہے ہیں جس سے ہیں تو سب کے سب خائف مگر اس کو قابو میں رکھنے پر راضی نہیں ہوتے ہیں، میں بعض اوقات تعجب سے سوچتا ہوں کہ اگر کسی دوسرے سیارے سے کوئی سیاح اور زائر اس زمین پر آئے تو وہ ہماری اس دنیا کو دیکھ کر کیا کہے گا وہ دیکھے گا کہ ہم سب اپنی ہی بربادی اور ہلاکت کے وسائل تیار کررہے ہیں اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کو اس کے طریقہ کی اطلاع بھی دے رہے ہیں۔ جس وقت مسٹر ایڈن نے یہ الفاظ کہے تھے اس وقت ان کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اس جنگ کے دوران ہی میں خداناشناس انسانی حکمت وصنعت کی ہلاکت خیزی اور آدم کشی اس درجہ کو پہنچ جائے گی کہ خود سائنس داں بھی اس کا تصور نہیں کرسکتے تھے"۔ (29)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قوموں کے حالات بیان کرتے ہوئے دور جدید میں عالمگیر جاہلیت کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اس وقت کوئی ایسی طاقت ور قوم یا جماعت جو ان مغربی قوموں سے عقائد و نظریات کا اختلاف رکھتی ہو، اور ان کے جاہلی فلسفہ اور مادی نظام زندگی کی مخالف ہو منظر عام پر نہیں ہے ایسی قوم یا جماعت اس وقت نہ یورپ میں پائی جاتی ہے نہ افریقہ اور ایشیا میں یورپ کے جرمن ہوں یا ایشیا کے جاپانی یا ہندوستان کے باشندے سب اس جاہلی فلسفہ اور اس مادہ پرستانہ نظام حیات کے قائل و معتقد ہیں یا ہوتے جارہے ہیں، باقی وہ سیاسی اختلاف اور قوموں کی سیاسی کش مکش جو اس وقت مختلف فلسفوں یا جنگوں کی صورت میں نظر آرہی ہے وہ محض اس بات کی کش مکش ہے کہ اس مادہ پرستی کی منزل مقصود کی طرف لے جانے کا منصب قیادت کس کے ہاتھ میں رہے: ایک قوم کی غیرت قومی اس کی روادار نہیں کہ دوسری قوم ایک مدت وراز سے دنیا کی قیادت پر فائز، زندگی کے مسائل و فوائد سے متنفع اور دنیا کے بازاروں، منڈیوں اور نو آبادیوں پر قابض رہے، حالانکہ کہ وہ قوت، علم، نظام، اور صلاحیت میں اس سے کسی طرح پیچھے اور کمتر نہیں، رہا یہ کہ وہ خودکسی اور منزل کی طرف بڑھنا اور دوسری قوموں کو لے جانا چاہتی ہے، زمین میں امن و انصاف قائم کرنا چاہتی ہے اور دنیا کا رخ بے دینی اور مادیت سے دین وروحانیت کی طرف، بداخلاقی سے اخلاق کی طرف، اور نفس وشیطان پرستی سے خداپرستی کی طرف پھیرنا چاہتی ہے تو اس غریب کو نہ اس کا دعویٰ ہے نہ یہ کبھی اس کا ارادہ ہے"۔ (30)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنے دور میں قوموں کے حالات زندگی پر گہری نظر رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ قوموں کے عادات واطوار پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں کہ کس ملک کی قوم کی کیا کر رہی اور کیسے زندگی گزار رہی ہے سیاسی یا مادی کشمکش کی وجہ سے قیادت کس کے ہاتھ میں ہے۔ حقیقی بات یہ ہے کہ جو قوم قیادت کے منصب پر فائز رہے اور اس کا اپنا کوئی مقصد حیات نہ ہو اور نہ اس کی توجہ لوگوں کی اصلاح اور ان کی تعلیم وتربت کی طرف ہو تو ایسے معاشروں میں منافع کی جگہ قوموں میں زوال پرستی کے رجحان کو فروغ ملتا ہے۔ اگر آپ اعلیٰ منصب پر فائز ہیں اور پھر بھی لوگوں میں عدل وانصاف نہ ہو اور لوگوں میں ظلم وستم ہو رہا ہے تو پھر اس قیادت وسیادت کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایسی قیادت مادیت کے حصول کے لیے تو استعمال ہو سکتی ہے مگر ایسی قیادت سے بہتر قوم کا نشو ارتقاء نہیں ہو سکتا۔ یہی صورت حال ہمیں آج پاکستان میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے جہاں حاکم اپنی تمام تر توجہ حکومتی پالیسیوں کی طرف لگا دیتے ہیں اور عوام الناس (جو کسی بھی قوم وملک کا بنیادی اثاثہ ہوتی ہے) کی طرف توجہ نہیں دی جاتی اور نہ ہی ایسی پالیسیاں مرتب کی جاتی ہیں جس سے عوام الناس کو فائدہ ہو یا کم از کم امید دلائی جا سکے، اس حوالے سے حکمرانوں کا قول وفعل میں تضاد مزید شکوک وشبہات کو جنم دیتا ہے جس کی وجہ سے عوام الناس میں منفی رائے عامہ پیدا ہوتی ہے اور حکمرانوں کے خلاف خروج کی آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایشیائی اور مشرقی قوموں کے حالات بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"ایشیائی اور مشرقی قومیں اور سلطنتیں مختلف رفتار کے ساتھ تہذیب وسیاست کی اس منزل کی طرف گامزن ہیں جس پر وہ مغربی قوموں کو دور سے دیکھ رہی ہیں، تہذیب واخلاق واجتماع کے وہی اصول ونظریات اور زندگی اور کائنات کے متعلق وہی نقطۂ نظر اختیار کرتی جا رہی ہیں جو ان مغربی قوموں کا شعار بن چکا ہے ان کے افراد کی سیرت مغربی اقوام کے افراد سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، ان کو مغربی اقوام غالب سے صرف اتنا اختلاف ہے کہ وہ سیاسی بیداری اور قوم پرستی کی بنا پر غیر ملکی حکومتوں کی سیادت اور اتالیقی پر اب راضی نہیں اور اس کو گوارا نہیں کرتیں کہ مغربی قوموں کی بڑی بڑی سلطنتیں اور شہنشاہیاں قائم رہیں، ان غالب قوموں کے افراد اپنی سلطنتوں کے اثر ورسوخ کی وجہ سے مادی فوائد اور ثمرات سے متمتع ہوں اور شوکت وعظمت اور عیش وعشرت کی زندگی گزاریں، ان مظلوم مشرقی قوموں کو خود اپنی سرزمین میں یہ فوائد حاصل نہ ہوں ان کو دراصل ان مغربی قوموں کے فلسفہ زندگی اور نظام سیاسی سے بنیادی اور اصولی اختلاف نہیں، پورے پورے قوم پرست لٹریچر میں اس کی طرف اشارہ بھی نہیں ملے گا، ان مشرقی اور ایشیائی قوموں کی صرف اس سے اختلاف

ہے کہ یہ نظام سیاسی ان کے ملک میں غیر ملکی چلائیں، وہ بے کم وکاست یا تفصیلات واجزا میں کچھ تغیر وترمیم کے ساتھ یہی نظام اپنے ملک میں خود چلانا چاہتے ہیں، گویا شطرنج کی بساط نہیں الٹنا چاہتے بلکہ صرف کھیلنے والے بدلنا چاہتے ہیں پھر ان میں سے بہت سی قوموں کی خود اپنی قدیم جاہلیت ہے، جس کے ساتھ ان میں سے بہت سی قوموں نے جاہلیت فرنگ بھی اختیار کرلی ہے اور اب جب کبھی ان کو اقتدار حاصل ہوگا وہ ان دونوں جاہلیتوں کے بہترین عناصر واجزا بروئے کار لائیں گے"۔(31)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مزید لکھتے ہیں کہ

"افراد میں جاہلی مغربی اخلاق اس طرح سرایت کرتے جارہے ہیں، جس طرح درختوں کے رگ وریشہ میں پانی تاروں میں بجلی دوڑ جاتی ہے، اسلامی ممالک میں مغربی مادیت اپنی پوری شان کے ساتھ دیکھنے میں آتی ہے، خواہشات نفس کی اندھا دھند پیروی زندگی کی بجھنے والی پیاس اور نہ مٹنے والی بھوک اس قوم میں بھی پیدا ہوتی جارہی ہے جس کے نزدیک آخرت کی زندگی اصل زندگی ہے، مغربی علوم اور تہذیب کے اثر سے آخرت کا خیال روز بروز کمزور ہوتا جارہا ہے، اور حیات دنیا کی اہمیت اور کشش بڑھتی جارہی ہے، اعزاز وفخر وجاہ کے حصول میں اور سربلندی اور سرفرازی کی کوشش میں بلند حوصلہ اور ترقی پسند مسلمان یورپ کے ترقی یافتہ لوگوں کے نقش قدم پر ہے، اصول واخلاق پر فوائد اور مصلحتوں کو ترجیح دینے کا مرض پھیل گیا ہے، مادی قوموں کی تقلید میں ظاہری نمائش اور کھوکھلے مظاہر کی گرویدگی بڑھ گئی ہے، انسانوں کی بندگی، قوت اور دولت کے سامنے سرافگندگی اور "شاہ پرستی" میں کہیں کہیں یہ موحد اور مجاہد امت ہشرک اور غلام طینت قوموں سے زیادہ ممتاز نظر نہیں آتی"۔(32)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس زوال اور پستی کے باوجود تمام اقوام کو نوید سحر دیتے ہوئے رقم طراز ہیں

"دوسری قومیں آسمانی ہدایت اور پیغمبروں کی تعلیم وحکمت کے سرمایہ کو یکسر کھو چکی ہیں اور صدیوں پہلے ان کے سفینوں اور ان کے سینوں میں یہ روشنی گل ہوچکی ہے، ماضی وحال کو مربوط رکھنے والے رشتہ کے ایک تار کو زمانہ کا ہاتھ کاٹ چکا ہے، اس کے برخلاف مسلمانوں کا دینی سرمایہ اور آسمانی ہدایت وحکمت کا سرچشمہ محفوظ ہے، رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور صحابہ کرام کی زندگی جس میں پوری امت کی تخلیق کی قوت ہے ان کے پاس موجود ہے، پھر اصحاب تجدید کا ایک غیر منقطع سلسلہ اور اصلاح وانقلاب کی دینی دعوت کا ایسا تسلسل ہے جس نے اس امت کو کسی دور میں بھی جاہلیت میں گم ہوجانے کا موقع نہیں دیا۔ مسلمانوں کے سارے نقائص کے باوجود یہ حقیقت اب بھی اسی طرح باقی ہے جاہلیت دنیا کے لئے جو نقشہ رکھتی ہے اور جس نقشہ پردہ

آج دنیا کو چلا رہی ہے، اس کے خلاف اگر کوئی نقشہ ہے تو صرف مسلمانوں کے پاس ہے اگرچہ مسلمان خود اس کو بھولے ہوئے ہیں، لیکن یہ نقشہ ابھی ضائع نہیں ہوا اور نہ کبھی ضائع ہو سکتا ہے مسلمان اپنے دین کے رد سے دنیا کے محتسب اور خدائی فوجدار ہیں جس دن وہ بیدار ہوں گے اور اپنا فرض منصبی انجام دیں گے وہ مشرق اور مغرب کی قوموں کے لئے روز حساب ہوگا انھیں کے خاکستر میں وہ چنگاری دبی ہوئی ہے جو کسی نہ کسی دن بھڑک کر جاہلیت کے خرمن کو جلا کر خاک کر دے گی"۔(33)

جدید دنیا کے اس دور میں میں جب کہ دنیا ایک گلوبل ولیج کی حیثیت اختیار کر گئی ہے، عالم انسانیت اپنی وسعت وسائل سفر کی فراوانی، نقل وحرکت کی آسانی اور اقوام و ممالک کے قرب واتصال کے باوجود پہلے سے کہیں زیادہ تنگ ہے اس وقت کا مادہ پرست انسان اس دنیا میں کسی دوسرے کی ہستی کو تسلیم نہیں کرتا، اور اپنے فوائد، خواہشات نفس اور خود پرستی کے سوا اس کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں، خود غرضی نے اس کی بھی گنجائش نہیں چھوڑی کہ کسی لمبے چوڑے ملک میں وو آدمی بھی زندہ رہ سکیں، تنگ نظر وطن پرستی ہر ایسے انسان کو جو اس کے وطن کے باہر پیدا ہونا نے کا قصوروار ہے نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے، اس کے ہر کمال کی منکر ہے اور اس کو ہر حق سے محروم کرتی ہے۔ پھر اس زندگی کی رہی سہی وسعت کو ان اہل سیاست وحکومت نے اور تنگ کر دیا ہے جو زندگی، وسائل معیشت اور خوراک کے سرچشموں اور ذخیروں پر قابض ہیں، وہ جس کے لئے چاہتے ہیں اس زندگی کو تنگ کر دیتے ہیں اور جس کے لئے چاہتے ہیں وسیع کر دیتے ہیں، بڑے بڑے وسیع شہر اور شاداب دزرخیز ملک لوگوں کے لئے بے فیض ہو گئے ہیں، قوموں کی قومیں اور پوری پوری آبادیاں نابالغ بچوں اور ناسمجھ یتیموں کی طرح دوسروں کی اتالیقی اور تولیت میں زندگی گزار رہی ہیں، انسان کا انسان پر اعتماد نہیں رہا، ہر ایک دوسرے کو بدگمانی اور شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنا حریف سمجھتا ہے، قرآن مجید کے بلیغ اور معجزانہ الفاظ کے مطابق زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تنگ ہو گئی ہے اور طبعیتیں اندر بھچنے لگی ہیں، تمدن اور حکومت کی نئی نئی بیڑیاں اور غلامی کے طوق لوگوں پر پڑتے جا رہے ہیں، ہر وقت ٹیکسوں اور نئے نئے محاصل کی بھرمار سے مصنوعی قحطوں کا خطرہ ہے، بیرونی اور اندرونی جنگیں سروں پر منڈلا رہی ہیں، فسادات، اسٹرائکیں اور ہڑتال زندگی کا لازمہ بن گئے ہیں۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں:۔

"بے شک آج بھی مذاہب کی ناانصافی سے اسلام کے عدل وانصاف کی طرف لانے کی ضرورت ہے، اس روشن خیال اور ترقی یافتہ زمانہ میں بھی ایسے مذاہب پائے جاتے ہیں جن کے عقائد وتعلیمات مضحکہ خیز ہیں جو اپنے

پیڑوں کو بے عقل اور بے شعور جانوروں کی طرح قابو میں رکھتے ہیں اور ان کو اپنے عقل و تفکر سے کام لینے کی اجازت نہیں دیتے، پھر کچھ مذاہب و نظام ایسے ہیں جو مذہب کہلانے کے روادار تو نہیں لیکن اپنے تسلط و اقتدار میں، اپنی غیر محدود طاقت و حکومت میں، اور اپنے پیرووں کی اندھی تقلید اور جوش عقیدت میں قدیم مذاہب سے کسی طرح کم نہیں ہیں، یہ وہ سیاسی نظام اور اقتصادی نظریات ہیں جن پر آج لوگ اسی طرح سے ایمان لارہے ہیں جیسے پہلے مذاہب وادیان پر ایمان لاتے تھ، یہ اس عصر کی قوم پرستی، وطن پرستی، جمہوریت ،اشتراکیت اور اشتمالیت وغیرہ ہے، یہ نئے مذاہب اپنی نارواداری، تنگ نظری اور بے رحمی میں قدیم جاہلی ادیان و مذاہب سے بھی بڑھے ہوئے ہیں، کسی سیاسی عقیدہ یا معاشی نظریہ سے اختلاف کی سزا آج اس سے کہیں زیادہ سخت ہے جتنی زمانہ سابق میں کسی مذہب یا عقیدہ سے اختلاف کی تھی، آج جب کسی پارٹی یا اصول کا اقتدار قائم ہوتا ہے تو مخالف جماعت کو زندگی کا حق بھی نہیں دیا جاتا اور اس اپنے اختلاف کی سخت سزا بھگتنی پڑتی ہے، اس زمانہ کی دو بڑی جنگیں کسی مذہبی اختلاف کی بناپر یا کسی مذہبی گروہ کی تحریک سے نہیں ہوئیں بلکہ محض سیاسی اغراض کے تصادم اور قومی خود غرضیوں کی بناپر ہوئیں، اسپین، چین کی خانہ جنگیوں (civilwar) جن کے سامنے چھٹی صدی مسیحی کی عیسوی دنیا کی مذہبی خانہ جنگی اور قرون وسطی کی کلیسا اور علم و فن کی کش مکش بھی گرو ہے کسی مذہبی اختلاف کیا پر نہ تھیں بلکہ محض ایک سیاسی اصول کے اختلاف اور اقتدار پسند گروہوں کی کش مکش تھی"۔ (34)

مولانا سید ابوالحس علی ندوی عالم اسلام کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اگر عالم اسلام کی خواہش ہے کہ نئے سرے سے وہ اپنی زندگی شروع کرے اور غیروں کی غلامی سے آزاد ہو، اگر وہ عالم گیر قیادت حاصل کرنا چاہتا ہے تو صرف تعلیمی خود مختار ہی نہیں بلکہ علمی لیڈرشپ بھی بہت ضروری ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں، یہ مسئلہ بہت گہرے غور و فکر کا محتاج ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وسیع پیمانہ پر تصنیف و تالیف اور علوم کی تدوین جدید کا کام شروع کیا جائے، اس کام کے سربراہ کار عصری علوم سے اتنی واقفیت اور گہری بصیرت رکھتے ہوں جو تحقیق و تنقید کے درجہ تک پہنچتی ہو اور اس کے ساتھ اسلام کے اصلی سرچشموں سے پورے طور پر سیر اب اور اسلامی روح سے ان کا قلب و نظر معمور ہو، یہ وہ مہم ہے جس کی تکمیل کسی جماعت یا انجمن کے لئے مشکل ہوگی، یہ اسلامی حکومتوں کا کام ہے، اس مقصد کے لیے اس کو منظم جماعتیں اور مکمل ادارے قائم کرنے ہونگے اور ایسے ماہرین فن کا انتخاب کرنا ہو گا جو ہر فن میں دسترس رکھتے ہوں، وہ ایسا نصاب تعلیم تیار کریں جو ایک طرف کتاب سنت کے محکمات اور دین کے ناقابل تبدیل حقائق پر

مشتمل ہو اور دوسری طرف مفید عصری علوم اور تجزیہ و تحلیل پر حاوی ہو وہ مسلمان نوجوانوں کے لئے علوم عصریہ کی از سر نو تدوین کریں جو اسلام کے اصولوں اور اسلام کی روح کی بنیاد پر ہو، اس میں ہر ایسی چیز ہو جو نو خیز طبقہ کے لئے ضروری ہو اور جس سے وہ اپنی زندگی کی تنظیم اوراپنی سالمیت کی حفاظت کر سکے، وہ مغرب سے مستغنی ہو اور مادی و دماغی جنگ میں اس کے مقابلہ میں آسکے، اپنی زمین کے خزانوں سے فائدہ اٹھائے اور اپنے ملک کی دولتوں کو استعمال میں لائے، اسلامی ملکوں کی مالیات کی نئی تنظیم کرے اور اس کو اسلامی تعلیمات کے ماتحت اس طرح چلائے کہ طرز حکومت اور مالیاتی امور کی تنظیم میں یورپ پر اسلامی نظام کی برتری صاف ظاہر ہو جائے اور وہ اقتصادی مشکلات حل ہو جائیں جن کے حل کرنے کے معاملہ میں یورپ سپر ڈال چکا ہے اور اپنی بے بسی کا معترف ہے۔ اس روحانی، صنعتی اور فوجی تیاری اور تعلیمی آزادی کے ساتھ عالم اسلام عروج حاصل کر سکتا ہے، اپنا پیغام پہنچا سکتا ہے اور دنیا کو اس تباہی سے نجات دلا سکتا ہے جو اسکے سر پر منڈلا رہی ہے، قیادت ہنسی کھیل نہیں، نہایت سنجیدہ معاملہ ہے اور منظم جدوجہد، مکمل تیاری عظیم الشان قربانی اور سخت جانفشانی کی محتاج ہے"۔(35)

خلاصہ بحث

الغرض ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی جو ایک گہری بصیرت کے مالک تھے، قوموں کے عروج زوال پر گہری نظر رکھتے تھے اور بخوبی جانتے تھے کہ قوموں کے عروج وزوال میں کون سے بنیادی عناصر شامل ہوتے ہیں جس کا برملا انھوں نے اپنی فکری دنیا میں اظہار بھی کیا ہے۔ کسی بھ قوم کے لیے اہم بات اس کا قوم ہونا ہے اور قوموں کا وجود نہ ہی ایسے تشکیل پاتا ہے کہ انھیں ہوا میں اڑا دیا جائیں اور نہ ایسی بقا ہے کہ وقتی تغیر کے ساتھ وہ خود کو سنبھال سکیں۔ قوموں کی بقا ان کے وجود سے نہیں بلکہ ان کے تمدن اور ان کی تاریخ سے ہوتی ہے۔ تاریخ ہی کسی قوم کو زندہ یا مردہ بناتی ہے، زندہ یا مردہ کہلانے میں ان اقوام کے کارنامیں نمایاں ہوتے ہیں اور یہی وہ کارنامیں ہوتے ہیں جس کی وجہ سے قومیں عروج زوال کی سیڑھیاں طے کرتیں ہیں۔ کسی بھی قوم کے زوال پذیر ہونے میں جو اہم عناصر شامل ہیں ان میں سے مطلق العنان بادشاہت، رعایا کے حقوق کی پامالی، مذہبی پیشواؤں میں اقتدار کی حوس، اخلاقی اقدار کا زوال، انسانیت کی تذلیل، رعایا میں معاشی تنگ دستی کا فروغ، قوم پرستی کا رجحان، انا پرستی اور خود غرضی جیسے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ اس کے بر عکس قوموں کے عرج کے بنیادی عناصر میں اتحاد و یکجہتی کا فروغ، تہذیب اخلاق، آئین و قانون کی بالا دستی، حکمران و رعایا کے باہمی حقوق کی تکمیل، شرف انسانیت اور باہمی حسن سلوک وغیرہ شامل ہیں۔ لہذا بطور

ملت و قوم ہمیں ان عناصر کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے جس سے ہم انسانیت کو دوام بخش سکیں اور قوم کا سر فخر سے بلند کر سکیں۔

آج ہمیں وطن عزیز پاکستان کے معروضی حالات کو بھی سامنے رکھ کر کوئی جامع لائحہ عمل ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ آج پاکستانی معاشرہ کئی طرح کے سنگین مسائل کا سامنا کر رہا ہے جن مسائل کو فوری حل کرنے کی ضرورت ہے ان مسائل کے حل میں معاشرے کا ہر فرد اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر مدد فراہم کر سکتا ہے۔ کوئی معاشرہ محض تخیلاتی تصورات کے بل بوتے پر یکجا نہیں رہ سکتا جب تک کہ وہ عملی اقدامات نہ کرے، اب وقت کا تقاضا ہے کی عملی اقدامات کیے جائیں، سیاست و حکومت سے لے کر معاشرت و معیشت تک میں اصلاح کرنے کی ضرورت ہے حکمران طبقہ خادم بن کر حکومت کرے اور عام طبقہ مثالی رعایا بن کے ان حکمرانوں کی اطاعت کرے تاکہ وطن عزیز میں بھی اسلامی تمدن کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے اور اس سنہرے دور کی بھی یادیں تازہ ہو سکتی ہیں جس کی بنیادیں ہمیں دور نبوی اور خلفائے راشدین کے ادوار سے ملتی ہیں۔ علمی اور فکری دنیا میں آگے بڑھنے کی ضرورت ہے تاکہ نہ صرف عالم اسلام بلکہ عالمی دنیا کی قیادت و سیادت کی جاسکے۔ مجھے امید ہے کہ اگر ہم نے علمی دنیا میں ترقی کر کے افکار کو تخلیق کیا تو کوئی بُعد نہیں کہ ہمیں دنیا کی قیادت وسیادت کو روکا جاسکے۔

---

[1] Nadvi, Muhammad al-Hasni,Tazkirah Sayed Shah Ilm Ullah, Maktaba Islam Gotan Road, Likhnow, P24

[2] Nadvi, Abu al-Hasan, Karwan Zindagi, Majlis Nashriyat Islam Karachi, 1985, V1, P34

[3] Ibid, V1, P 90

[4] Ibid, V1, P 150

[5] Nadvi, Abu al-Hasan, Abu al-Hasan Ali Nadvi Swanehi Khaka, Murattab Dr. Safeer Akhtar, P91

[6] Nadvi, Abu al-Hasan, Insani Duniya par Muslmano ke Arooj-o-Zwal ka Asar, Majlis Nashriyat Islam Karachi, P15

[7] Ibid, P78

[8] Ibid, P79

[9] Robert Briffault, The Making of Humanity,London, G. Allen & Unwin ltd, P. 159

[10] Arabs Conqust of Egxpt and the last thirty year of the Roman Dominion,Oxford University Press 1978, p.42

[11] Robert Briffault, The Making of Humanity P. 160

[12] Nadvi, Abu al-Hasan, Insani Duniya par Muslmano ke Arooj-o-Zwal ka Asar, P92

[13] Arthur Kirsten Sen, Iran after Sassanids,Translator Dr. Muhammad Iqbal,Anjman Traqi urdu Dihli,p161

[14] Muhammad Kurd Ali, Khitat al-sham, Maktaba Noori Damishq, 1983, V5, P47

[15] Nadvi, Abu al-Hasan, Insani Duniya par Muslmano ke Arooj-o-Zwal ka Asar, P92

[16] Ibid, P 184

[17] Ibid, P 294

[18] Ibid, P 387.88

[19] Ibid, P295

[20] Ibid

[21] C. E. M. Joad,Guide to Modern Wickedess,London , Faber and Faber, 1939 P. 153

[22] Imam Abu Dawood, Sunan Abu Dawood, Abwab al-Noum, Bab Fil Asbiyah, Hadith No.5121

[23] Imam Nisaai, Sunan Nisaai, Kitab Tahreem-u-dam, Bab al-Talgheez feena qatil, Hadith No. 4119

[24] Nadvi, Abu al-Hasan, Insani Duniya par Muslmano ke Arooj-o-Zwal ka Asar, P300-301

[25] C. E. M. Joad,Guide to Modern Wickedess, P. 153

[26] Nadvi, Abu al-Hasan, Insani Duniya par Muslmano ke Arooj-o-Zwal ka Asar, P302

[27] Ibid, P310

[28] C. E. M. Joad,Guide to Modern Wickedess,P. 153

[29] Nadvi, Abu al-Hasan, Insani Duniya par Muslmano ke Arooj-o-Zwal ka Asar, P331

[30] Ibid, P389

[31] Ibid, P390.91

[32] Ibid, P392

[33] Ibid, P394

[34] Ibid, P399.400

[35] Ibid, P427.28